شمل اور تاریخِ ادبِ اردو

ڈاکٹر سہیل ممتاز خان
اسسٹنٹ پروفیسر اردو
گورنمنٹ دیال سنگھ کالج، لاہور

SCHIMMEL AND HISTORY OF URDU LITERATURE

Sohail Mumtaz Khan, PhD
Assistant Professor of Urdu
Govt. Diyal Singh College, Lahore

Abstract

Annamarie Schimmel was a renowned orientalist. Her main claim to fame is her life-long interest in Sufi tradition of Islam. She was well versed in many eastern languages including Pakistan's national language-Urdu. She studied Urdu literature in depth. Her book "Classical Urdu Literature from the beginning to Iqbal" is a true example of her deep understanding and interest in Urdu. Despite shortcomings, this book is a valuable addition to Urdu by a foreigner. She elaborated Urdu's classical poetry and proved her much appreciated literary acumen regarding 18th and 19th century Urdu literature. This book primarily is a portrayal of Urdu literature for Western readers.

Keywords:

این میری شمل، مرزا محمد عسکری، سید احتشام حسین، محمد صادق، اردو،
اسلامی، ادب، تاریخ

یہ تحقیقی جست جو، این میری شمل (۲۰۰۳۔۱۹۲۲ء) کی ان کاوشوں سے متعلق ہے جو بہ راہ راست اردو ادب کے تعارف سے منسلک ہے۔ ہمارے پیشِ نظر ان کی تالیف CLASSICAL URDU LITERATURE FROM THE BEGINNING TO IQBAL ہے جو اشاعتی ادارے اوٹو ہیرازووٹز (OTTO HARRASSOWITZ) سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ تحقیقی کاوش اس بسیط علمی سرمائے کا حصہ ہے جو معروف ماہرِ ہند جین گونڈا (JAN GONDA) کی نگرانی میں مرتب ہوا؛وہ سنسکرت کے ایک بڑے عالم تھے۔ان کا تعلق ہالینڈ سے تھا اور ان کے ذمہ ہندوستانی ادب یا بہ الفاظِ دگر آریائی ادب کی تاریخ کو مرتّب کرنا تھا؛چناں چہ مرکزی عنوان A HISTORY OF INDIAN LITERATURE کی ذیل میں متعدد صاحبانِ علم نے ہندوستان کے جملہ مذہبی،تاریخی، تہذیبی، ثقافتی، لسانی اور سری علوم سے فنون لطیفہ تک کے مباحث کا احاطہ کرنے کی جست جو کی۔اس ساری کدو کاوش کے پسِ پردہ محرکات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم شمل کے ادبی تاریخی شعور کو مرکزِ نگاہ بنانا چاہیں گے کہ یہ ایک ایسی منفرد کوشش ہے جس سے ان کی ادب فہمی کے بہت سے نئے حوالے سامنے آتے ہیں۔

شمل نے اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے ہندوستان کے اسلامی ادب (ISLAMIC LITERATURE OF INDIA) اور سندھی ادب (SINDHI LITERATURE) کے حوالہ سے جدا تفحصات پیش کیے جو شماریاتی تصحیح کے بعد بالترتیب والیم ۸، حصہ یا جُزاول اور والیم ۹، حصہ یا جُزاوّل پر مشتمل ہے جب کہ موضوعِ گفت گو حصہ جو اردو ادب سے بہ راہِ راست متعلق ہے اس سیریز کی جلد ہشتم کے حصہ سوم کی شماریاتی شناخت لیے ہوئے ہے۔جدید ادب کی بابت مطالعہ پیش کرنے کی کاوش گوپی چند نارنگ کی جانب سے نظر آتی ہے جو اسی جلد کا حصہ چہارم ہے۔شمل نے یہ مطالعہ یا سیریز کا حصہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے نام کیا جو صفحہ ۱۲۵ سے ۲۶۱ کو محیط ہے اور تین ابواب میں منقسم ہے؛یعنی بابِ اوّل جو ابتدائی دور سے متعلق ہے، بارھویں سے سترھویں صدی عیسوی تک کے ادب کا احاطہ کرتا ہے۔شمالی ہند میں اردو ادب کے آغاز کی بابت بارھویں سے چودھویں صدی عیسوی اور دکن میں اردو کی نشوونما کے حوالہ سے پندرھویں سے سترھویں صدی عیسوی کو شامل کیا گیا ہے اور گجرات، گلبرگہ، بیجاپور، گولکنڈہ، اورنگ آباد کو مبحث کا حصہ بنایا ہے۔اس ضمن میں مرتب ہونے والا کام بہت سی اہم معلومات لیے ہوئے ہے۔

بابِ دوم ۱۷۰۰ سے ۱۸۵۰ء تک کے ادبی رجحانات کو سمیٹتا ہے جب کہ باب سوم غالب سے اقبال تک کی ادبی کار گزاریوں کو سامنے لاتا ہے۔ اس تحقیقی و تنقیدی مطالعے کے مآخذ و مصادر میں جو کتب معاون ہوئیں ان میں دتاسی کی Historie de la Litterature Hindouie et Hindoustani کا والیم ۳ جو پیرس سے ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا، اس کے علاوہ رام بابو سکسینہ کی A History of Urdu Literature (مترجم مرزا محمد عسکری)، ٹی۔ جی۔ بیلے (T.G.BALLEY) کی A History of Urdu Literature جو شمل کے نزدیک اگرچہ مختصر ہے لیکن معلوماتی ہے کے علاوہ جو اہم کتابیں اور مصنفین کے نام ملتے ہیں ان میں اے بوسانی (A. Bausani) کی Storia Delle letterature del Pakitan, Milano History of Urdu Literature سید احتشام حسین کی (Istoria Literatury Urdu Moscow)، محمد صادق کی A History of Urdu literature کے A .N. Gelbov کی Suchocey, Literatura Urdu اور عبدالحیٰ کی گلِ رعنا کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وحید قریشی اور نقوش کے خصوصی غزل، افسانہ اور شخصیات نمبر کا حوالہ موجود ہے۔ مزید یہ کہ یورپین، ہندوستانی اور پاکستانی کتب خانوں کی فہارس سے بھی معاونت حاصل کی گئی ہے۔

اس کتاب کا اختصاص یہ ہے کہ اس کے حاشیے میں موجود مصادر و منابع جس کثرت اور وقیع حوالوں کی صورت موجود ہیں وہ ادبی کتب کی تواریخ میں بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یعنی ایک بات کے لیے بیسیوں منابع موجود ہیں البتہ ایڈیٹر کے اس نوٹ کے سبب کتاب کی قدر و منزلت متاثر ہوئی۔ جین گونڈا کا انتہائی مختصر پیش لفظ کچھ یوں ہے:

> ''پروفیسر شمل اسے لکھتے ہوئے اپنے رفقائے کار کی ممنون رہیں، جنھوں نے گم نام رہنا پسند کیا (اور) نہ صرف کارآمد تجاویز دیں بل کہ دکنی ادب خاص طور سے، فیض و نذیر اور نثری ادب کے باب دوم (اور) سوم کی بابت گراں قدر نکات اور غیر شائع شدہ تحریری مواد بھی فراہم کیا۔''(۱)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ مترشح ہے کہ شمل کا یہ سارا کام طبع زاد نہیں اور یوں بھی ان کے ہاں کبھی اس کتاب کے حوالہ سے کوئی علمی تخصیص نظر نہ آئی۔ انھوں نے فراخ دلی سے ایڈیٹر کے نوٹ کی موجودگی میں اس کتاب پر اپنا نام لکھنا منظور کیا اور تاریخِ ادب کے مبادی مباحث پر کہیں کہیں گراں قدر

تفحصات پیش کیے۔ یہ کتاب زبانِ اردو کی نشوونما کی بابت بہت سی اہم معلومات کی حامل ہے اور اپنے بسیط حوالوں کے سبب اردو کی منتخب تواریخ میں اہم جگہ پانے کی اہلیت رکھتی ہے۔

کتاب کا پہلا باب جو اردو کی نشوونما کے ابتدائی عہد کو محیط ہے، کا تعارف پیش کرتے ہوئے شمل لائقِ اعتنا اسناد پیش کرتی ہیں اور اس ضمن میں صوفیہ کرام کی ابتدائی کاوشیں مرکزِ نگاہ بناتی ہیں؛ اِس عہد کی مجموعی تہذیبی و معاشرتی فضا کے ساتھ ساتھ سیاسی پس منظر بھی احسن انداز پر پیش ہوا، اور یہ ایک ایسا موضوع ہے جو شمل کی بہ راہِ راست انسیت اور لگاؤ سے عبارت ہے یعنی شمل جن کا اختصاص ہی الٰہیات و تصوف ہے، کے بیان میں ہمیشہ آسودگی اور ارزانی محسوس کرتی ہیں:

> ''ابتدائی دور کے مسلم صوفیہ نے اپنا کام بہ زبانِ فارسی قلم بند کیا؛ تاہم تذکروں سے یہ واضح ہے کہ خواجہ اشرف غنی سمنانی نے اپنی تعلیمات، علمی مقالے کی صورت، ہندی زبان میں بہ عنوان اخلاقِ تصوف (یعنی) صوفی مسلک کی اخلاقیات، تحریر کیں؛ لیکن بہت کم منصہ شہود پر آئیں۔ اکابر صوفیہ کرام جیسا کہ پاکپتن کے فریدِ گنج شکر (۱۲۶۵ء) اور حمید الدین ناگوری (۱۲۷۴ء)، اسی طرح ۱۴ ویں صدی عیسوی کے بو علی قلندر، شرف الدین یحییٰ منیری کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ ان کی جانب سے مختصر کلمات اور شاید چند جملے مقامی زبانوں میں ادا ہوئے۔''(۲)

شمل نے اس کتاب میں لفظ کی ادائگی کے ضمن میں جو صوتی طریقۂ کار اپنایا، وہ قدرے دشوار ہے اور اس سے الفاظ کے درست مخارج یا تلفظ کے بہتر فہم کی ارزانی محسوس نہیں ہوتی اور یوں لفظ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، مثلاً لفظ 'تذکرہ' کو 'tadkira' اور 'خواجہ' کو 'Hwaja' لکھنا اور اس صورت میں یہ اہتمام کہ انگریزی حرف کے نیچے الٹی قوس لگا دی جائے، ایسے تمام مختارات ممکن ہے کہ کسی مروج اہم ضابطے سے متعلق ہوں لیکن قاری کے لیے یہ ایک مشکل قرأت ہے اور لفظوں کا انشراح آسان نہیں۔

شمل نے اردو کے آغاز کی بابت من جملہ انھی تصورات و خیالات کی باز آفرینی کی ہے جو تاریخ کی دیگر ادبی کتب میں بالاستعیاب موجود ہیں، تاہم اس فرق کے ساتھ کہ محمود غزنوی کے ساتھ آنے والی سپاہ یا اس کے جوان یہاں بولی جانے والی مختلف زبانوں کو مجموعی طور پر کس طرح سے دیکھ رہے تھے اس بابت شمل کا بیان کچھ یوں ہے:

''گیارھویں صدی کے آغاز میں جب افغان حکم ران محمود غزنوی کے فتح مند سپاہیوں نے (جو ایک طرح سے) سنّی اسلام کے محافظ تھے، شمالی ہندوستان کو تاراج کیا تو پراکرت (وسط ہندوستان کی زبان جو فطری طور پر سنسکرت سے برآمد ہوئی) ابلاغ کے لیے اپنی اہمیت پہلے ہی سے کھو چکی تھی اور مقامی معروف بولیاں، اس کی جگہ لے چکی تھیں جو بالآخر متعدد ہندوستانی زبانوں کی موسس قرار پائیں۔ شمال مغربی ہندوستان میں سرہندی بولی (شہر سرہند سے منسوب۔ فارسی میں سرِ ہند 'ہندوستان کا سرا یا آغاز') بڑی حد تک بولی جا رہی تھی؛ اور دہلی کے جنوب اور جنوب مشرقی علاقوں میں، برج اور اودھی بولی جا رہی تھیں۔ ان بولیوں کی ایک سادہ ساخت، کھڑی بولی کہلائی (یعنی ایک) مقتدر زبان۔ مسلمان جو (عموماً اس بابت) کچھ نہیں جانتے تھے یا مقامی محاورے کی بابت کم معلومات رکھتے تھے، ان بولیوں کو ہندوی یا ہندوستانی کہنے لگے۔''(۳)

ایسا صرف مسلمانوں ہی کی جانب سے نہیں ہوا کہ مقامی بولی جانے والی زبان کو ہندوستانی یا ہندوی کہا گیا بل کہ سترھویں سے انیسویں صدی کے وسط تک بیشتر مستشرقین بھی اردو کو اسی نام سے پکارتے رہے۔ مولانا محمد حسین آزاد (۱۹۱۰ء)، حافظ محمود شیرانی (۱۹۴۶ء)، ڈاکٹر مسعود حسین (۲۰۱۰ء) اور ڈاکٹر جمیل جالبی (۲۰۱۹ء) کے ہاں اردو کی ابتدائی صورتوں کی بابت مختلف النوع آرا ملتی ہیں تاہم سب اس امر پر متفق ہیں کہ اردو کی ساخت یا اس کا کینڈا مقامی زبانوں سے خمیر اٹھاتا ہے۔ کہیں اس کی پشت پر کھڑی بولی، پنجابی، اودھی، برج بھاشا، اپ بھرنش نظر آئی تو کبھی اس کے ابتدائی ماخذ دکن کی خود مختار ریاستوں کے مذہبی ادب میں تلاش کیے گئے۔ امیرانِ صدہ کی بغاوت کا معاملہ ہو یا عہدِ تغلق میں دارالحکومت کی دولت آباد منتقلی، اردو کی ابتدائی نشو و نما کی بابت بہت سے مفروضے اور تفحصات موجود ہیں اور ہر بڑے ماہر لسان نے اس ضمن میں مقدور بھر اسناد فراہم کی ہیں۔ غرض شمل نے اس بابت جو حقائق قاری کو فراہم کیے، وہ پہلے سے موجود مطالعات کی روشنی میں مرتب نظر آتے ہیں۔ ایک معروف رائے یوں ہے:

"ہماری زبان اردو برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔"(۴)

"زبانِ اردو اس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی اور جس کا تعلق شور سینی پراکرت سے بلا واسطہ تھا۔ یہ زبان جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہے، زبانِ اردو کی اصل اور ماں سمجھی جا سکتی ہے گو کہ "اردو" کا نام

اس زبان کو عرصہ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبانِ اردو کی صرف و نحو، محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اس میں استعمال ہونا اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی، اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی زبانِ عام بن گئی جس کی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی جو اس زبان کا ابتدائی مرکز تھا مسلمان حملہ آوروں اور بادشاہوں کی جائے ورود اور ان کا دارالسلطنت بنا ہوا تھا۔۔ برج بھاشا جو متھرا اور اس کے جوانب میں بولی جاتی تھی، گو اس بھاشا سے جو اطرافِ دہلی میں بولی جاتی تھی بہت مشابہت رکھتی ہے مگر پراکرت کی ایک علیحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ یعنی دلی بھاشا ہمارے خیال میں زبانِ اردو کی اصل سمجھی جاسکتی ہے۔"(۵)

"سینتی کمار چیٹر جی کے نظریے میں ڈاکٹر زور کی مطابقت ملتی ہے۔ وہ اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ ۱۱۹۳ء میں فتح دلی کے بعد جس نئی بولی کا سلسلہ شروع ہوا اس کی بنیاد پنجابی اور مغربی اترپردیش کی مغربی اپ بھرنش پر تھی۔۔۔ اس زبان کی ابتدا تشکیل اور ارتقا میں فوجی مہمات کا گہرا دخل ہے۔ اس زبان کا لسانی سفر ان فوجی مہمات کے زیرِ سایہ طے ہوتا رہا ہے۔"(۶)

دیگر اہم مؤرخینِ ادب کی مانند شمل بھی، اردو کی ارتقائی منازل میں، صوفیہ کرام کے کردار کو خاص اہمیت دیتے ہوئے عین الدین گنج العلم (۱۳۹۶ء۔۱۳۰۶ء) کو اردو زبان کا پہلا نثر نگار قرار دیتی ہیں جن کی زندگی کا بیشتر حصہ گجرات میں گزرا اور انتقال سے کچھ عرصہ پہلے بہمنی دربار سے متعلق ہوئے۔ صوفیانہ افکار کو ہندوی زبان میں منتقل کرنے والی اولیں شخصیت جو دہلی کے سلاطین کے ہاں بھی معروف تھی۔(۷)

شمل، زبانِ اردو کی تشکیل میں جن مختلف شخصیات کو موضوعِ مبحث بناتی ہیں ان میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۱۴۲۱ء۔۱۳۲۱ء)، فخر الدین نظامی، شیخ محمد خوب چشتی (۱۶۱۴ء)، شمس العشاق شاہ میراں جی (۱۴۹۶ء)، برہان الدین جانم (۱۵۸۲ء)، امین الدین عالی (۱۶۷۵ء) کے علاوہ رزمیہ شاعری کے معروف شاعر کمال خاں رستمی شامل ہیں۔ شمل نے محض افراد و شخصیات کے نام لینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بل کہ نظم و نثر کی معروف تخلیقات کی صراحت کرتے ہوئے ان کے جملہ خصائص پر روشنی ڈالی ہے، مثلاً نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اور شاہ میراں جی کی 'شرحِ مرغوب القلوب'۔

اردو کی رزمیہ شاعری کی بابت شمل کا یہ تفحص لائقِ اعتنا ہے:

'یہ عادل شاہی (حکم رانوں) کا مقتدر اور رئیسانہ دربار تھا کہ جہاں اردو رزمیہ شاعری کا صناعانہ کام مرتب ہوا۔ اس کا مئولف کمال خان رستمی جو سلطان محمد عادل شاہ (۱۶۵۶ء۔۱۶۲۶) کے معتمد خاص کا بیٹا تھا۔ اس نے دکنی رزمیہ خاور نامہ 'کتابِ مشرق' ۱۶۴۹ء میں لکھا (جو ایک طرح سے) یہ محمد عالم شاہ کی بیگم اور عبداللہ قطب شاہ کی بہن خدیجہ کے حکم پر لکھا گیا۔ یہ چوبیس ہزار ابیات پر مشتمل، دکن کی طویل مثنویوں میں سے ایک ہے؛ فارسی نمونہ کے مطابق اسے باتصویر مرتب کیا۔ اس نظم میں رستمی نے فردوسی کے شاہ نامہ سے بھی کچھ خیالات (مستعار) لیے، جیسا کہ جمشید اور بہمن، اسفندیار کے بیٹے کی کہانیاں؛ تاہم کچھ مضامین ہندو شاعر چند ابردائی کی شجاعانہ شاعری سے لیے گئے۔'(۸)

اسی طرح مرزا محمد مقیمی (۱۶۶۵ء) کا قصہ چندر بدن اور مہیار، حسن شوقی (۱۰۵۰ھ۔۱۰۴۶ھ) اور صنعتی (۱۶۴۵ء) کا قصہ بے نظیر، میراں ہاشم (۱۶۹۷ء) کے مراثی، ملک خوشنود کا قصہ 'غمِ یوسف علیہ السلام اور زلیخا، نصرتی (۱۶۷۳ء) کی گلشنِ عشق اور غواصی (۱۶۵۶ء) کی بدیع الکمال کو اپنے بیانیہ کا حصہ بناتے ہوئے شمل، علی عادل شاہ دوم اور محمد قلی قطب شاہ (۱۶۱۱ء) کی بابت کسی قدر اہم معلومات فراہم کرتی ہیں۔ کتاب کا پہلا باب جو اردو کے اولیں دور سے متعلق ہے، اہم شعرا اور نثر نگاروں کا تعارف لیے ہوئے ہے۔

شمل، قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا لوک (Folk) شاعر تسلیم کرتی ہیں اور ان کی شاعری کے جملہ خصائص نمایاں کرنے کی جستجو کرتی ہیں۔ جن دیگر ادبا اور شعرا کی بابت گفت گو ملتی ہے ان میں غواصی، نشاطی (۱۵۷۳ء)، وجہی (۱۶۵۹ء) اور ملک محمود جائسی (۱۵۴۲ء) اہمیت کے حامل ہیں۔ نصرتی کی بابت قدرے تفصیل موجود ہے غرض غواصی کی طوطی نامہ، ملا وجہی کی قطب مشتری اور سب رس سے فتاحی نیشاپوری (۱۴۴۸ء) کی تصنیف 'حسن و دل'، ابن نشاطی کی پھولبن، فائز (۱۷۳۸ء) اور تحسین الدین کی مثنوی کام روپ پر نقد و تحقیق پیش کرتے ہوئے لوک شاعری اور شعرا کی بابت تعارفی توضیحات یک جا کرتی ہیں۔ یہ کلاسیکی ادب کا ایک مختصر انسائیکلوپیڈیا ہے جس کے منتخب اور لائقِ اعتبار حوالہ جات ذیلی حاشیہ میں مرصع ہیں۔ دکن میں ابتدائی مرثیے کی بابت شمل کچھ یوں رقم طراز ہیں:

'چوں کہ دکنی ریاستیں کاملاً شیعہ تھیں اس لیے محرم میں کربلا کے دل دوز واقعات کی یادآوری (سرکاری) اداروں کا معمول تھا؛ درحقیقت محمد قلی قطب شاہ کا یہ اختصاص ہے کہ انھوں نے

دکنی میں پہلا مرثیہ کہا۔ یہ صنف بار آور ہو چکی ہے اور اب یہ آل پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مصائب کو انتہائی متاثر کن انداز میں بیان کرتی ہے۔

اس کی ایک بھرپور نظیر ہاشم علی کے مرثیہ میں کچھ یوں رقم ہے:

افسوس، تمھارا خون آلود کفن اصغر !

افسوس، تمھارا پیاس سے سوکھا منہ اصغر !

تمھارا سرخ بدن پھول اصغر !

افسوس، تمھاری شیر خواری پر اصغر !۔۔۔۔۔۔۔' (۹)

یہ اقتباس گراہم بیلی اور ڈاکٹر مسیح الزماں کی اسناد لیے ہوئے ہے اور چوں کہ یہ کتاب، ایڈیٹر کے مطابق شمل کی کاملاً طبع زاد نہیں ہے اس لیے ہم اس کی تحقیقی چھان پھٹک سے گریز کرتے ہوئے اجمالاً جائزہ ہی کو کافی سمجھتے ہیں؛البتہ جہاں کہیں شمل کا ذاتی فہم تنقید کی خوب وزشت صورت سامنے لاتا ہے اسے نشان زد کرنا ضروری ہے؛اور یہاں یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ جسے ہم شمل کا فہمِ ذاتی قرار دے رہے ہیں وہ بھی قیاسی نوعیت کا ہے؛اور اس کا سبب یہ ہے کہ کتاب میں یہ مذکور نہیں کہ کون سا حصہ شمل کا تحریر کردہ ہے اور کون سا متصرف ہے۔ ولی دکنی کی بابت بہت سی اہم معلومات فراہم کرتے ہوئے شمل اردو کی کلاسیکی روایت کے پس منظر میں کچھ یوں خیال آرا ہیں:

''وہ کلاسیکی اسلامی مطالعات میں اس قدر مہارت لیے ہوئے تھا کہ اس نے ایہام کی متاثر کن اصطلاح ایجاد کی۔ ہر رات تمھاری طویل زلف مطول سے نبرد آزما ہے۔ جب کوئی تمھارا منہ دیکھتا ہے تو ایک معمولی لفظ مختصر کہتا ہے۔ مطول، طوالت لیے اور مختصر، اختصار لیے دو ایسی توضیحات ہیں جنھیں وسطی عہد سے جڑے فلسفی تفتازانی نے سکاکی کے مفتاح العلوم میں بیان کیا۔ زلفیں بہت طویل ہیں اور سیاہ جیسے رات، (جب کہ) منہ دن میں بہت معدوم دکھائی دیتا ہے۔''(۱۰)

کتاب کا بابِ دوم ۱۷۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک ادبی سفر کا احاطہ کرتا ہے اور یہاں ایک بار پھر ملک محمد جائسی کی پدماوت سے شمال میں اردو کے ابتدائی شاعر صدرالدین محمد فائز کی بابت بات کرتے ہوئے اہم تاریخی وقوعات کا عکس پیش کیا گیا ہے یعنی اورنگ زیب کی وفات سے بہادر شاہ ظفر تک کے جملہ سیاسی معاملات صراحتاً مذکور ہیں۔ فائز کی بابت شمل کا کہنا ہے کہ عہدِ ولی ہی میں ان کا دیوان ۱۷۱۴ء میں

مرتّب ہو چکا تھا اور پھر اردو کے چار اہم ستون اور ان کے مقلدین کا ذکر کرتے ہوئے خان آرزو(۱۷۵٦ء)، شاہ مبارک نجم الدین آبرو(۱۷۴۷ء) اور دہلی کے ابتدائی شعرا کو تسوید کا حصہ بناتی ہیں، اور ذیلی حاشیہ میں مصادر کی جمع آوری نظر آتی ہے۔ اردو کے چار اہم ستون کی بابت شمل یہ وضاحت کرتی ہیں کہ مولانا حسین آزاد(۱۹۱۰ء) نے ان میں جن مشاہیر کو شامل کیا وہ مرزا مظہر جانِ جاناں(۱۷۸۱ء)، میر درد(۱۷۸۵ء)، میر تقی میر(۱۸۱۰ء)اور مرزا رفیع سودا(۱۷۸۱ء)ہیں۔ پیش آئندہ ناقدینِ ادب نے جزوی تبدیلی کی اور مرزا مظہر جانِ جاناں کے بدل میں میر حسن(۱۷۸٦ء) کو اہم گردانا اور یوں اردو سے جڑی ہندوستان کی ادبی زندگی کی چار مختلف سمتیں نمایاں ہو گئیں۔ شمل کی تحریر ادائگیِ تلفظ کے باعث بار بار متاثر ہوتی ہے اور یوں افراد و شخصیات، مقامات اور تصانیف تک کے اسما کی شناخت، کارِ دشوار ہے۔ یہ کتاب کا بڑا سقم ہے۔

اس کتاب میں اسلام اور بانیِ اسلام کی بابت اخلاص موجود ہے۔ خواجہ میر درد کے حوالہ سے بات کرتے ہوئے شمل کچھ یوں گویا ہیں:

> ”اگرچہ بہت سے لوگ جو درد کی پاکیزگی، فقیری اور سادگی، جو دلوں کو مسخر کرتی ہے کی تعریف کرتے ہیں، شاید یہ نہیں جانتے کہ اس شاعر نے خود کو محمد (ﷺ) کے دینِ خالص کا مجدّد قرار دیا ہے۔“(۱۱)

دینِ محمد ﷺ کے لیے لفظ 'unalloyed' کا استعمال کس قدر لگاوٹ لیے ہوئے ہے۔ یعنی شمل اسلام کو بے آمیزش اور خالص دین کے طور پر شناخت کرتی اور کراتی ہیں۔ درد کے بعض شعروں کا ترجمہ بھی مرقوم ہے اور ذیل میں دیے گئے شعر کا ترجمہ انتہائی موزوں ہے:

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

"When I could not see Thee and all Thy majesty,
I do not care if I saw the world or did not see...(12)

اردو کے وہ اہم تذکرے جن کا حوالہ ادبی تواریخ میں بہ کثرت موجود ہے اور جنھیں معتبر جانا گیا ہے، میں میر کا نکات الشعرا، علی حسین گردیزی(۱۸۰۹ء) کا تذکرہ ریختہ گویاں اور قائم چاندپوری(۱۷۹۳ء) کا مخزنِ نکات شامل ہے۔ کتاب میں ان کا ذکر اجمالاً موجود ہے؛ علاوہ ازیں جن

مثنویوں کو گفت گو کا حصہ بنایا گیا ان میں محمد اسمٰعیل طپش کی بہارِ دانش اور میر اثر کی خواب و خیال خاص طور سے مذکور ہے۔ میر زا رفیع سودا کی بابت قدرے تفصیل ملتی ہے۔ان کی شاعری کے جملہ خصائص نشان زد کرتے ہوئے شہر آشوب کے بارے اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں؛البتہ تلفظ کے حوالہ سے یہاں بھی اشکال جنم لیتے ہیں اور قاری کو دقت کا سامنا ہے۔ سودا کی مرثیہ نگاری کی صراحت میں، وہ انھیں اس صنف میں رجحان ساز قرار دیتی ہیں کہ اردو مرثیہ میں مسدّس کی ہیئت متعارف کرانے میں ان کو تفوق حاصل ہے۔(۱۳)

میر تقی میر کے حوالہ سے محاکمہ موجود ہے۔ میر کی غزل اور مثنویات کو مبحث کا حصہ بناتے ہوئے بہت سے اہم اشعار انگریزی میں نقل کیے ہیں اور جامع اسناد فراہم کی ہیں، مثلاً میر کے تغزل کی بابت قریباً بارہ سے زائد اہم حوالہ جات صفحہ ۷۸ اپر ذیلی حاشیہ میں موجود ہیں۔ میر کے وہ چند اشعار جن کو انگریزی کے قالب میں ڈھالا گیا ہے ان میں ایک اہم شعر کا موزوں ترجمہ کچھ یوں ہے:

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

Don't call me a poet-for I have collected
Much grief and much sorrow to make it a diwan! (14)

تاہم کسی مقام پر شعر کا ترجمہ بے محل معلوم ہوتا ہے، مثلاً یہ شعر اور اس کا انگریزی ترجمہ دیکھیے:

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی جانے، باغ تو سارا جانے ہے

Leaf by leaf and plant by plant has known our state;
Whether they know, whether they don't even though the rose may not know-yet the whole garden knows it.(15)

انگریزی ترجمہ کے دوسرے مصرعہ میں لفظ they کا استعمال فہم سے بالا ہے البتہ پہلا مصرع ترجمہ کی اچھی نظیر ہے۔ میر کی مثنویوں کی بابت ایک قدرے مختلف اور وقیع تفحص کچھ یوں ہے:

''ایک جانب حزن کا یہی انداز اور پسندیدہ مصرعوں کی تکرار ہے اور دوسری جانب کلیدی الفاظ میر کی مثنویوں میں نمایاں ہیں۔ یہ تمام نغمیہ مناظر قدرے مختصر ۲۳۴تا۲۹۷ سطروں کے درمیان ہیں۔ معاملاتِ عشق، شاید ایک طرح کی ناخوش محبت کی سوانح ہے۔ کہانیوں کا المیہ انجام، پنجاب اور

سندھ کی لوک کہانیوں کی باز آفرینی ہے جو عموماً عاشق کی موت پر ختم ہوتی ہیں: عہدِ میر میں کچھ پنجابی کہانیاں اردو شاعری میں از سرِ نو کہی گئیں جیسا کہ مہابت خان کا زبان زدِ عام قصّہ، سسّی پنوں۔ ان کی مثنویوں کے آغاز میں تکرار کا ایک طویل سلسلہ ہے: شعلۂ عشق، 'آتشِ محبت' کو جزوی طور پر گارساں دی تاسی نے ترجمہ کیا۔"(۱۶)

میر تقی میر کے بعد شمل، میر حسن اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے ایک معروف شاعر کی سرخی تلے نظیر اکبر آبادی (۱۸۳۰ء) کی بابت بات کرتے ہوئے ان کا بین البرا عظمی مقام متعین کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور اے۔ بوسانی (A. Bausani) اور معروف روسی اسکالر Glebov کی نظیر میں ذاتی دل چسپی کے معاملات سامنے لاتی ہیں کہ کس طرح مذکورہ شخصیات نے ان کی شاعری کو عالمی سطح پر متعارف کرایا، اور بہتر نقد پیش کیا۔ اسی باب میں لکھنؤ کے نوابین کی بابت بہت سی اہم معلومات ملتی ہیں اور لکھنوی معاشرت کا تقابل سلطنتِ عثمانیہ کے دورِ گلِ لالہ (Tulip Period) سے کیا جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں کچھ وقت کے لیے سامنے آیا (۱۸-۱۷۳۰ء) اور پھر منظر سے ہٹ گیا۔

لکھنوی معاشرت سے جڑے شعرا میں میر سوز (۱۷۹۸ء)، غلام ہمدانی مصحفی (۱۸۲۵ء)، انشاءاللہ خاں انشاء (۱۸۱۷ء) کے بارے میں گفت گو کرتے ہوئے ضمناً مرثیہ نگار میر ضمیر (۱۸۵۵ء) اور میر مستحسن خلیق (۱۸۴۴ء) کا تعارف کراتی ہیں اور خاص طور سے مصحفی اور انشاء کی اہم تصانیف رانی کیتکی اور دریائے لطافت پر توضیحی مباحث رقم کرتی ہیں۔ ریختی کے موضوع پر نواب سعادت یار خان رنگین (۱۸۳۴ء) اور میر علی یار خان جان (۱۸۸۶ء) صاحب کی بابت اہم معلومات سامنے لاتی ہیں علاوہ ازیں مرزا نظام الدین ممنون (۱۸۴۳ء)، شاہ نصیر الدین ناصر (۱۸۳۸ء)، امام بخش ناسخ (۱۸۳۸ء)، علی اوسط رشک (۱۸۶۷ء)، وزیر علی صبا (۱۸۸۵ء)، سیّد محمد خان رند (۱۸۵۷ء)، تصدق حسین شوق (۱۸۷۱ء)، آغا حجو شرف (۱۸۸۷ء)، دیا شنکر نسیم (۱۸۴۵ء)، فضل علی فضلی (۱۷۳۲ء)، خلیق اور مظفر حسین ضمیر (۱۸۵۵ء) کے باہم تقابل میں عالمی منظر نامہ پیش کرتی ہیں اور یہی اس کتاب کا اختصاص ہے کہ گلزارِ نسیم کا تذکرہ ہو یا مرثیہ نگاری کا، شمل جو معلومات بہم پہنچاتی ہیں وہ انتہائی منفرد ہیں۔ گلزارِ نسیم اور اودھ میں مرثیہ نگاری کے حوالہ سے شمل کچھ یوں گویا ہیں:

''رفقائے آتش میں اہم ترین شخص ہندو دیا شنکر کول نسیم ہیں۔۔۔انھوں نے معروف مثنوی گلزارِ نسیم (یعنی) گلشن کی ہوائے سبک ۱۸۳۷ء میں لکھی جس کی اساس نہال چند کے نثری متن مذہبِ عشق پر ہے (اور) گارساں دی تاسی کے ترجمہ نے اس کتاب کو یورپ میں (بہ عنوان) 'گلِ بکاؤلی' متعارف کرایا۔۔۔کہ ادبا (مرثیہ نگاروں) نے سماجی اور جذباتی سہوِ زمانی اور جغرافیائی اعتبار سے، بڑی حد تک، ساتویں صدی عیسوی/اول صدی ہجری کے عراق کو انیسویں صدی کے اودھ سے خلط ملط کر دیا ہے (جو) میرے لیے ان یورو پین مصوروں سے زیادہ قابلِ اعتراض نہیں جنھوں نے بائبل کے وقوعات زیریں جرمن علاقے اور اطالوی ماحول میں پیش کیے۔'' (۱۷)

اردو داستان کے تعارف میں شمل، میر امن (۱۸۰۶ء) کی باغ و بہار کی بابت قریباً خاموش ہیں۔ خلیل علی خان اشک کی داستانِ امیر حمزہ اور رجب علی بیگ سرور (۱۸۶۹ء) کی فسانۂ عجائب کی بابت کسی قدر صراحت موجود ہے، لیکن میر امن کو جس طرح سے نظر انداز کیا گیا ہے، اس کی کوئی معقول توجیہہ میسر نہیں؛ اور جو معمولی ساذکر ہے وہ بھی فسانۂ عجائب کے ضمن میں ہے۔ اسی طرح ترجمہ کے جملہ محرکات کی نشان دہی کرتے ہوئے گلکرسٹ کی ہندوستانی ڈکشنری کا حوالہ سامنے آتا ہے اور فورٹ ولیم کالج میں شائع ہونے والی کتب کے مصادر و منابع سے آشنائی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں، اس حوالہ سے، ایک مخصوص طریقہ کار ملتا ہے:

''سنسکرت اساس، بعینہٖ ایک اور نصیحت آموز کتاب، طوطی نامہ ہے، کتابِ طوطی جسے فارسی میں نخشبی نے ۱۴ویں صدی عیسوی میں منتقل کیا اور دکنی میں جسے غواصی نے صراحتاً پیش کیا (جب کہ) اردو میں اس کی سب سے کام یاب موافقت میر محمد بخش حیدری (۱۸۲۳ء) کی توتا کہانی (۱۸۰۱ء) ہے جو محمد قادری کے سترھویں صدی کے متن پر انحصار کرتی ہے؛ یہ متعدد بار شائع ہوئی اور بعد میں بہ زبانِ سندھی ترجمہ ہوئی۔ حیدری نے حسین واعظ کاشفی کی روضتہ الشہداء کو (بہ عنوان) گل مغفرت (۱۸۱۲ء) میں ترجمہ کیا۔' (۱۸)

تذکرہ نگاری، لارڈ میکالے کی پالیسی اور اس کے نتیجے میں اردو کا فروغ اور پھر 'جامِ جہاں نما' ایسے رسائل کی بابت گفت گو کے اہم پیرائے موجود ہیں۔ باب کے اختتام میں اندر سبھا کی اہمیت خاص طور سے اجاگر کی گئی ہے۔ شمل اس ضمن میں کسی قدر سیر حاصل گفت گو اپنی کتاب

German Contributions to the Study of Pakistani Linguistics. Hamburg میں کر چکی ہیں یہاں ان کا اعادہ غیر ضروری ہے۔

کتاب کا تیسرا باب عہدِ غالب سے اقبال کو محیط ہے۔ کلاسیکی شاعری کے اختتام کی ذیلی سرخی تلے غالب (۱۸۶۹ء) اور کلامِ غالب کا مطالعہ پیش کرنا فہم سے بالا ہے کہ ہماری پوری انیسویں صدی، شعری سطح پر، کلاسیکی آثار لیے ہوئے ہے ایسے میں کلاسیکی عہد کے خاتمہ کا نقارہ بجا دینا، غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہاں شمل سے ایک بار پھر غالب کے تلمذ کی بابت چوک واقع ہوئی کہ اس نوع کی غلطی وہ اپنی کتاب A Dance of Sparks- Imagery of Fire in Ghalib's poetry میں کر چکی ہیں۔ غالب کی بابت ایک پھیلا ہوا تحقیقی و تنقیدی بیانیہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ علاوہ ازیں جن دیگر شعرا پر نقد موجود ہے ان میں مومن خان مومن (۱۸۵۲ء) اور مرزا داغ دہلوی (۱۹۰۵ء) نمایاں ہیں۔ مصادر اور اسناد کی ذیل میں دی تاسی اور گراھم بیلی کا نام بہ کثرت پڑھنے کو ملتا ہے۔ باب کے اسی حصہ میں The Reformist کے عنوان سے اصلاح پسندوں کے احوال سے تعارض نظر آتا ہے۔ سر سیّد (۱۸۹۸ء)، آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد (۱۹۱۲ء) کی بابت قدرے توضیحی علمی نکات موجود ہیں اور ان اصحاب کی جملہ مساعی ہدفِ نگاہ بنائی گئی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بارے میں ذیل کا اقتباس اہمیت کا حامل ہے:

''جدید اردو نثر کی بابت، ان کی خدمات کے اعتراف میں، ایڈن برگ یونیورسٹی نے اعزازی طور پر ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ نذیر احمد بنیادی طور پر مترجم تھے، جنھوں نے انگریزی قانونی متون اردو میں ترجمہ کیے، جیسا کہ مجموعۂ تعزیرات، آمدنی پر لاگو قانون اور ہندوستان کا قانونِ شہادت۔ انھوں نے اسلامی قوانین اور اصل عربی (متن) کے بغیر قرآنِ حکیم کا خوب صورت ترجمہ پیش کیا۔ قانونی تراجم کا شعبہ (جو) کسی قدر غیر تخلیقی ہے، نے ان کے ناولوں کو پس منظر فراہم کیا جو تعلیمی مسائل سے مملو ہیں۔''(۱۹)

اس عہد کے دیگر نام ور لکھنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے شمل اہم علمی معلومات سامنے لاتی ہیں۔ رتن ناتھ سرشار (۱۹۰۳ء)، شرر (۱۹۲۶ء) اور رسوا (۱۹۳۱ء) کی جملہ کار گزاریوں کا ایک پُر اثر مرقع دیکھنے کو ملتا ہے؛ البتہ میر امن کی طرح منشی پریم چند (۱۹۳۶ء) کی بابت گفت گو انتہائی معمولی ہے اور ان کا ذکر محض تبرکاً موجود ہے؛ اور پھر یہ کہ ان کا سنِ وفات غلط طور پر مرقوم ہے یعنی اکتوبر ۱۹۳۶ء کی

بجائے ۱۹۳۰ء تحریر کیا گیا ہے۔ شمل کی یہ رائے بھی محلِ نظر ہے کہ انھوں نے صرف ۱۹۱۴ء تک اردو کہانیاں لکھیں۔(۲۰) سجاد حیدر یلدرم (۱۹۴۳ء) اور پارسی تھیٹر کے بارے میں مناسب اور دل چسپ خیالات کا اظہار ہے کہ کس طرح معروف پارسی ڈراما نگار نوشیر واں جی مہرواں جی آرام نے میر حسن کی مثنوی سے اپنے ڈرامے بے نظیر و بدرِ منیر کی صورت گری کی۔

عبوری دور کے ادبا کی ذیلی سرخی تلے جن شعرا اور مشاہیر کے نام ملتے ہیں ان میں محمد اسمٰعیل میر ٹھی (۱۹۱۷ء۔ ۱۸۴۴ء) نظم طباطبائی (۱۹۳۳ء۔ ۱۸۵۲ء) منشی احمد علی شوق قدوائی (۱۹۲۵)، منشی درگاہ شاہی سرور، تلوک چند محروم (۱۹۶۶ء)، پنڈت برج نرائن چکبست (۱۹۲۶ء)، علی برادران اور ان کی جملہ مساعی (صحافت اور سیاست کے میدان میں)، مزید براں مولانا ظفر علی خان، سر عبدالقادر، خوشی محمد ناظر، شاہ دین ہمایوں، سید امداد حسین امداد، سید علی محمد شاد عظیم آبادی، یاس یگانہ چنگیزی، سید علی نقی زیدی سیفی، مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، سید نوّاب انوار حسین آرزو لکھنوی جو غزل سے تھیٹر ڈرامہ اور بالآخر بمبئی فلم انڈسٹری سے منسلک ہو گئے، کے علاوہ فانی بدایونی، اصغر حسین گونڈوی، علی سکندر جگر مرادآبادی، سید فضل الحسن حسرت موہانی، وحشت رضا علی کلکتوی اور اثر لکھنوی شامل ہیں۔ حسرت موہانی کے بارے میں اوروں کی نسبت کسی قدر صراحت ہے۔ شعرا اور ادبا کے علمی اور ادبی کمالات کا تعین کرتے ہوئے مصادر و منابع، ذیلی حاشیہ میں بہ کثرت پیش کیے گئے ہیں۔ شمل نے باب کے اس حصہ میں قریباً ۱۹۵۰ء اور ۶۰ء تک کے ادبی عہد کو شامل کیا ہے اور خاص طور سے صنفِ غزل کو مرکزِ نگاہ بنایا۔ بنیادی طور پر یہ تعارف مغرب کے قاری کے لیے ہے؛ اگرچہ اہم مصادر اور ان کا بہ کثرت مرقوم ہونا غیر معمولی بات ہے اور یہ اردو کے قاری اور ایک سنجیدہ محقق کے لیے معتبر حوالہ جات ہیں۔ اس سے نہ صرف کتاب کی وقعت بڑھتی ہے بل کہ استفادے کی ایک سے زائد صورتیں جنم لیتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال کی ذیلی سرخی تلے جو مبحث موجود ہے وہ متعدد صفحات کو محیط ہے۔ اردو ادب میں یہ شمل کا پسندیدہ ترین موضوع ہے۔ حضرت خواجہ میر درد اور غالب کے حوالہ سے اہم اور جدا کتب موجود ہیں تاہم جس شخصیت سے شمل والہانہ لگاؤ رکھتی ہیں وہ اقبال ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ اقبال سے شمل کی وابستگی کی اساس مولانا روم ہیں جو منصور حلاج کے بعد مسلم صوفیہ میں، شمل کی محبت کا مرکزہ ہیں۔ اس ضمن میں ہم بیسویں صدی کے اوائل میں ان تہذیبی و سیاسی عوامل کو نظرانداز نہیں کر سکتے جو

ترکی اور جرمنی کے مابین فروغ پارہے تھے۔ جرمن ادبا کا مشرق اور اس کی سریت سے حظ اٹھانے کا سلسلہ قریباً اٹھارہویں صدی کے اواخر سے شروع ہوا، اور زندگی کی متحرک تعبیروں سے متحد ہوتے ہوئے بیسویں صدی کی آخری دہائیوں کو جالیتا ہے۔

شمل نے اس حصہ میں چند حوالے اپنی کتاب Gabriel's Wings سے دیے ہیں، دیگر مصادر میں ڈاکٹر سید عبداللہ، یوسف حسین خان، جے مارک، بی اے ڈار، اے بوسانی، آر۔اے نکلسن اور اے۔جے آربری کے نام نمایاں ہیں۔

اقبال کے علاوہ سرسری طور پر جن شعرا کا ذکر ہوا ان میں حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیارپوری اور جوش ملیح آبادی خاص طور سے نمایاں ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(1) Schimmel, Annemarie."Classical Urdu Literature from the beginning to Iqbal."Jan Gonda. Edit. A History of Indian literature. Wiesbaden: Otto Harrassowitz, 1975

(2) Ibid. p. 129.

(3) Ibid. p.127, 128

(۴) محمد حسین آزاد۔آبِ حیات۔لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء ص ۱۰

(۵) رام بابو سکسینہ۔تاریخِ ادبِ اردو۔کراچی: غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۱ء، ص ۲۶،۲۵

(٦) تبسم کاشمیری، ڈاکٹر۔اردو ادب کی تاریخ۔ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۲۲

(7) Schimmel, Annemarie. Classical Urdu Literature from the beginning to Iqbal. p.132

(8) Ibid. p.137

(9) Ibid. p.151

(10) Ibid. p.154, 155

(11) Ibid. p.171

(12) Ibid. p.172

(13) Ibid. p.178

(14) Ibid. p.180

(15) Ibid. p.182

(16) Ibid. p.183

(17) Ibid. p. 199, 200

(18) Ibid. p.209

(19) Ibid. p.231

(20) Ibid. p.235

❖❖❖